Fikr-o-Nasar (Islamabad) 17:10 (1980)

اقبال: مقاصدِ تعلیم

بختیار حسین صدیقی

تصورات کی دنیا میں غرق افلاطون کے لئے فلسفہ ایک "پیاری خوشی" تھا۔ تصور کے بجائے عمل میں منہمک اقبال کے لئے یہ ایک "خیرِ کثیر" ہے کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ "جسے حکمت دی گئی اسے خیرِ کثیر دی گئی"(۱)۔ عمل اور خیر دونوں کا تعلق طرب زارِ تخیل سے نہیں بلکہ دنیائے آب و گل سے ہے جسے نبی اکرمؐ نے "آخرت کی کھیتی" کہا ہے۔ فلسفی ابدیت کا خاموش تماشائی نہیں بلکہ اس کے تقاضوں کو عملی جامہ پہنانے کا داعی ہے۔ اس کا مقصد یہ نہیں کہ "انسان بیٹھا ہوا زندگی کی حقیقت پر غور کیا کرے بلکہ اس کی اصلی غایت یہ ہے کہ زندگی کی سطح کو بتدریج بلند کرنے کے لئے ایک مربوط اور متناسب عمرانی نظام قائم کیا جائے"(۲)، اور جب یہ محسوس ہو کہ اس نظام کی زندگی کی اعلیٰ رفعتوں تک رسائی نہیں رہی ہے تو اس کی از سرِ نو تشکیل کی جائے۔ اس مفہوم میں فلسفی معاشرے کا محافظ ہے، ثقافت کا طبیب ہے "دیدۂ بینائے قوم" ہے جو جامد معاشرے میں حرکت کی روح پھونکتا ہے تاکہ ابدیت کے جو تقاضے ہیں انہیں پورا کرنے کے لئے یقین اور اعتماد کے ساتھ قدم آگے بڑھایا جائے۔ ابدیت کو زندگی میں ایک رواں دواں قوت بنانے کا انحصار تعلیم پر ہے کیونکہ وہ ثقافتی ورثے کو نئی نسل میں منتقل کر کے اس کا تحفظ ہی نہیں کرتی بلکہ علم میں روز افزوں ترقی کے متوازی روحانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اس کی تنظیمِ نو بھی کرتی ہے جو "قومی ہستی کے سلسلے کو بلا انقطاع قائم"(۳) رکھنے

کی لازمی شرط ہے۔ آئیے اب ہم دیکھیں کہ اس نصب العین کے پیش نظر فکر اقبال کی روشنی میں تعلیم کے کیا مقاصد متشکل ہوتے ہیں ؟

اقبال کے ذہنی ارتقا کے مختلف مدارج کو سامنے رکھ کر ہم ان کی تعلیمی فکر کو مندرجہ ذیل چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں :

۱۔ پہلے دور کا آغاز ۱۸۹۹ء میں ہوتا ہے جس سال انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفے میں ایم اے کیا اور اختتام ۱۹۰۵ء میں ہوتا ہے جب وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان گئے۔ اس دور میں انہوں نے بچوں کی تعلیم و تربیت پر خالص نفسیاتی اصولوں پر مبنی ایک مقالہ لکھا جو جنوری ۱۹۰۲ء کے مخزن میں شائع ہوا۔ یہ مقالہ ان کی تعلیمی فکر کا نقطۂ آغاز ہے۔

۲۔ دوسرے دور کی ابتدا ۱۹۰۵ء میں ان کے انگلستان پہنچنے پر ہوتی ہے جہاں کی آب و ہوا نے خود ان کے الفاظ میں انہیں "مسلمان کر دیا" اور اختتام ۱۹۱۴ء میں ہوتا ہے جس سال ان کی والدہ کا انتقال ہوا اور پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی۔ اس دور میں انہوں نے علیگڑھ کالج میں "اسلام ایز اے سوشل اینڈ پولیٹیکل آئیڈیل" کے موضوع پر انگریزی میں ایک لکچر دیا (دسمبر ۱۹۱۰ء) جس کا ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے عنوان سے کیا اور برکت علی اسلامیہ ہال میں سنانے کے علاوہ پنجاب ریویو بابت مارچ اپریل ۱۹۱۱ء میں شائع کیا۔ اس لکچر میں انہوں نے مسلمانوں کی مخصوص ملی روایات کے تحفظ اور ان کی "قومی ہستی کے سلسلے کو بلا انقطاع قائم" رکھنے کے لئے ایک نئے "مثالی دارالعلوم" کے قیام پر زور دیا۔

۳۔ تیسرا دور ۱۹۱۵ء میں شروع ہوتا ہے جس سال ان کی فارسی مثنوی اسرار خودی شائع ہوئی اور اس طویل خط پر ختم ہوتا ہے جو انہوں نے اس کے انگریزی مترجم آر۔ اے نکلسن کو بعض غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے ۱۹۲۱ء میں لکھا۔ اس دور میں انہوں نے خودی

کی نشوونما کے ذریعے زندگی کے تسلسل و تمول کو تعلیم کا اصل مقصود قرار دیا۔

۴۔ چوتھے دور کی ابتدا اس مقالے سے ہوتی ہے جو انہوں نے "فقہ اسلامی میں اجتہاد کے تصور" پر انگریزی میں لکھا اور ۱۹۲۲ء میں حبیبیہ ہال کے ایک جلسے میں پڑھا اور اختتام ۱۹۳۸ء میں ان کی وفات پر ہوتا ہے۔ اس دور میں "فکر دینی کی تعمیر نو" ان کی توجہ کا مرکز بنی جسے انہوں نے "قومی ہستی کے سلسلے کو بلا انقطاع قائم رکھنے کے لئے" تعلیم کا اولیں مقصد قرار دیا۔

یہ تقسیم صرف مطالعے میں سہولت کی خاطر کی گئی ہے ورنہ ویسے ذہن ایک عضوی وحدت ہے جس کے ارتقاء کی مختلف کڑیوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اب ہم ان ادوار کی فکری خصوصیات سے بحث کریں گے اور ان کی روشنی میں تعلیم کے ان مقاصد کا تعین کریں گے جو یکے بعد دیگرے اقبال کے سامنے آئے۔

پہلا دور

فلسفے میں ایم۔ اے کرنے کے بعد اقبال نے مئی ۱۸۹۹ء سے مئی ۱۹۰۳ء تک چار سال اورینٹل کالج لاہور میں میکلوڈ عربک ریڈر (ریسرچ فیلو) کی حیثیت سے کام کیا۔ اس عرصے میں انہوں نے "نظریۂ توحید مطلق پیش کردہ شیخ عبدالقادر جیلانی" مرتب کی جس میں ابن عربی اور عبدالکریم الجیلی کے نظریۂ انسان کامل سے بحث کی گئی ہے۔ تاریخ کے موضوع پر اسٹبز (STUBBS) کی کتاب ارلی پلین ٹے جینیٹس (EARLY PLANTEGENENTS) اور اقتصادیات پر واکر (WALKER) کی کتاب پولیٹیکل اکونومی (POLTICAL ECONOMY) کی اُردو میں تلخیص اور ترجمہ کیا اور علم الاقتصاد پر خود اُردو میں ایک کتاب لکھی۔ جون ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۵ء تک انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر (فلسفہ) کام کیا۔ ۱۹۰۵ء میں تین سال کی رخصت پر اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان چلے گئے۔ یہ ہے اقبال کی ذہنی تشکیل کا ابتدائی دور۔ اس دور میں اسلامی نظریۂ توحید، تاریخ، معاشیات، فلسفہ اور نفسیات ان کی دلچسپیوں کا محور ہیں۔ یورپ کی جذبۂ انسانیت (HUMANISM) کی تحریک سے وہ بہت متاثر ہیں جسے وہ "بڑی حد تک ان قوتوں کا نتیجہ" سمجھتے ہیں "جو اسلامی فکر سے بروئے کار آئیں"۔ اپنی اس رائے کا اظہار انہوں نے ۱۹۲۵ء میں صاحبزادہ

آفتاب احمد خان کے نام ایک خط میں ان الفاظ میں کیا۔ "یہ کہنا بالکل مبالغہ نہیں ہے کہ جدید یورپین "جذبۂ انسانیت" کا جو ثمر جدید سائنس اور فلسفے کی شکل میں برآمد ہوا ہے اسے کئی لحاظ سے محض اسلامی تمدن کی توسیع پذیری کہا جا سکتا ہے۔ اس اہم حقیقت کا احساس نہ آج کل کے یورپین کو ہے اور نہ مسلمان کو"(۴)۔ اسی "جذبۂ انسانیت" سے سرشار ہو کر انہوں نے "بچوں کی تعلیم و تربیت" پر خالص نفسیاتی اصولوں پر مبنی ایک مقالہ لکھا جو جنوری ۱۹۰۲ء کے مخزن میں شائع ہوا۔ اس مقالے میں نوجوان اقبال نے تعلیمی عمل کو بچوں کی خودرو (SPONTENEOUS) حرکت پر مرکوز کرنے پر زور دیا، جو قدرت نے وافر مقدار میں انہیں ودیعت کی ہے کیونکہ اسی پر ان کی "جسمانی اور روحانی نمو" کا دارومدار ہے اور ساتھ ہی تعلیم کی یہ غایت متعین کی کہ وہ انسان کو "انسان کامل" بنائے۔ ان کے نزدیک" تمام قومی عروج کی جڑ بچوں کی تعلیم ہے۔ اگر طریق تعلیم علمی اصولوں پر مبنی ہو تو تھوڑے ہی عرصے میں تمام تمدنی شکایات کافور ہو جائیں۔ انسان کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ دنیا کے لئے اس کا وجود زینت کا باعث ہو اور جیسا کہ ایک یونانی شاعر کہتا ہے اس کے ہر فعل میں ایک قسم کی روشنی ہو جس کی کرنیں اوروں پر پڑ کر ان کو دیانت داری اور صلح کاری کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا سبق دیں۔ اس کی ہمدردی کا دائرہ دن بدن وسیع ہونا چاہیئے تاکہ اس کے قلب میں وہ وسعت پیدا ہو جو روح کے آئینے سے تعصبات اور توہمات کے زنگ کو دور کر کے اسے مجلاّ اور مصفّا کر دیتی ہے۔ صدہا انسان ایسے ہیں جو دنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں مگر اپنے اخلاقی تعلقات سے محض جاہل ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی بہائم کی زندگی ہے کیونکہ ان کا ہر فعل خود غرضی اور بیجا خودداری کے اصولوں پر مبنی ہوتا ہے۔ ان کے تاثرات کا دائرہ زیادہ سے زیادہ اپنے خاندان کے افراد تک محدود ہوتا ہے اور وہ اس مبارک تعلق سے غافل ہوتے ہیں جو بحیثیت انسان ہونے کے ان کو باقی افراد بنی نوع سے ہے۔ حقیقی انسانیت یہ ہے کہ انسان کو اپنے فرائض سے پوری پوری آگاہی ہو۔ اس قسم کا کامل انسان بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر بچے کی تربیت میں یہ غرض ملحوظ رکھی جائے کیونکہ یہ کمال اخلاق، تعلیم و تربیت

ہی کی وساطت سے حاصل ہو سکتا ہے(۵)"۔ تعلیم کا اصل مقصود یہ ہے کہ وہ انسان کو انسان بنائے اور "حقیقی انسانیت" اس بات پر مشتمل ہے کہ "دنیا کے لئے انسان کا وجود زینت کا باعث ہو"۔ وہ "دیانت داری اور صلح کاری" کا پیکر ہو۔ اس کی "ہمدردی کا دائرہ دن بدن وسیع ہو" یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو ایک ایسے "عظیم الشان درخت کی ایک شاخ محسوس" کرنے لگے جس کی جڑیں تو زمین میں پیوست ہیں لیکن "اس کی شاخیں آسمان کے دامن کو چھوتی ہیں"۔

اس لادینی جذبۂ انسانیت کا سحر انگلستان پہنچنے پر ٹوٹ گیا۔ یورپ کی جغرافیائی وطن پرستی اور جارحانہ قوم پرستی کو انسان کے خون سے ہولی کھیلتے دیکھا تو اقبال کی آنکھیں کھل گئیں۔ یہ تھی یورپ کی وہ آب و ہوا جس نے انہیں "مسلمان کر دیا"۔ اب ان کے دل میں احترام آدمیت کا خدا پرستانہ جذبہ ابھرا جس کی نشوونما کو انہوں نے تعلیم کا اصل مقصود قرار دیا۔ ۱۹۲۵ء کا سال نو کا پیغام خالصتاً "احترام آدمیت" کا پیغام ہے جس کو عملی جامہ پہنائے بغیر ان کے نزدیک دنیا میں امن ہرگز قائم نہیں ہو سکتا۔ وہ پیغام یہ ہے "انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے اور جب تک تمام دنیا کی علمی قوتیں اپنی توجہ کو محض احترام انسانیت کے درس پر مرکوز نہ کر دیں، یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی رہے گی۔ کیا ہم نے نہیں دیکھا کہ ہسپانیہ کے باشندے ایک نسل، ایک زبان، ایک مذہب اور ایک قوم رکھنے کے باوجود محض اقتصادی مسائل کے اختلاف پر ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں اور اپنے ہاتھوں اپنے تمدن کا نام و نشان مٹا رہے ہیں۔ اس ایک واقعے سے صاف ظاہر ہے کہ قومی وحدت بھی ہرگز قائم و دائم نہیں۔ وحدت صرف ایک ہی محترم ہے اور وہ ہے بنی نوع انسان کی وحدت جو رنگ، نسل اور خون سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو مٹایا نہ جائے گا، جب تک انسان اپنے عمل

کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا، جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے اعتبارات کو نہ مٹایا جائے گا، اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکے گا اور اخوت، حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ معنی نہ ہوں گے۔"(۶)

"احترام آدمیت" وہ معاشرتی غایت ہے جس پر تعلیمی عمل کو مرکوز ہونا چاہیئے اور یہ غایت وہی غایت ہے جس کی تلقین محسن انسانیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبۂ حجۃ الوداع میں ہمیں کی: "لوگو! اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اے انسانو ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں جماعتوں اور قبیلوں میں بانٹ دیا کہ تم الگ الگ پہچانے جا سکو۔ تم میں زیادہ عزت اور کرامت والا خدا کی نظروں میں وہی ہے جو خدا سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ پس نہ کسی عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت حاصل ہے نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر۔ نہ کالا گورے سے افضل ہے نہ گورا کالے سے۔ ہاں بزرگی اور فضیلت کا اگر کوئی معیار ہے تو وہ تقویٰ ہے"۔ انسان سارے ہی آدم کی اولاد ہیں اس لئے وہ سب اخوت، محبت اور ہمدردی کے مستحق ہیں رنگ، خون اور نسل کے امتیازات سے بالا اخوت اور ہمدردی کے اس جذبے کی نشو و نما تعلیم کا اولین مقصد ہے۔

تعلیم کی غایت کے تعین کے بعد دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس غایت کو حاصل کس طرح کیا جائے؟ وہ کون سے ایسے اصول ہیں جن کے مطابق اگر تعلیم دی جائے تو یہ غایت کما حقہ حاصل ہو جائے۔ اقبال کے نزدیک ان اصولوں کو ہمیں بچے کی ارتقار پذیر فطرت میں تلاش کرنا چاہیئے۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ "وہ کون سے ایسے امور ہیں جو عالم طفلی کے ساتھ مختص ہیں تاکہ بچوں کی تعلیم و تربیت میں ان کو ملحوظ رکھا جائے اور ان سے باحسن وجوہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے"۔ دوسرے الفاظ میں تعلیم کو بچوں کی نشو و نما کے اصولوں، ان کی ذہنی قوتوں کے مدارج نمو، ان کی دلچسپیوں، ضرورتوں اور امنگوں کے مطابق ہونا چاہیئے۔ نفسیاتی اعتبار سے بچوں کی "جسمانی اور روحانی نمو" کا دار و مدار ان کی "اضطراری (خود رو)

حرکت" پر ہے جو قدرت نے وافر مقدار میں انہیں ودیعت کی ہے۔ اس خودرو جوش کے عالم میں ان کے "حواس خود بخود حرکت میں آتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں خارجی اشیاء کا رفتہ رفتہ علم ہوتا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بچہ ایک متعلم ہستی نہیں بلکہ سراپا ایک متحرک ہستی ہے جس کی ہر طفلانہ حرکت سے کوئی نہ کوئی تعلیمی فائدہ اٹھانا چاہیئے(۸)"۔ بچہ خود اپنے آپ کو تعلیم دیتا ہے۔ استاد کا کام یہ ہے کہ وہ اس کی صلاحیتوں کے "مدارج نمو" کے مطابق نصاب میں مواد مہیا کرے اور فطرت کی ترتیب کی سختی سے پابندی کرے۔ فطرت کی ترتیب میں چونکہ ادراک کی صلاحیت سب سے پہلے نمودار ہوتی ہے اور اس کے بعد علی الترتیب حافظے، تخیل اور فکر و تمیز کی صلاحیتیں، اس لئے نصاب میں تدریسی مواد کی درجہ بندی اسی ترتیب کے مطابق کی جائے اور بتدریج محسوس حقائق سے مجرد تصورات کے علم کی طرف بڑھا جائے۔ "بچے سے ایسے تصورات کے علم کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے جس کے ضمنی مدرکات (محسوسات) کا علم ہی اس کو نہیں ہے(۹)"۔ مثلاً "حب وطن" اور "خدا کی صفات" ایسے مجرد تصورات ہیں جن کے تعقل کے لئے ضروری ہے کہ بچے کا ذخیرۂ علم وسیع ہو اور اس کی قوت عقل و فکر کافی ترقی کر چکی ہو۔ لیکن نصاب کی تدوین میں اکثر اس اصول کا لحاظ نہیں رکھا جاتا اور ابتدائی جماعتوں کی درسی کتب میں حُبّ الوطنی اور "خدا کی صفات" جیسے مجرد تصورات پر مبنی اسباق کتاب کے شروع ہی میں رکھ دیئے جاتے ہیں۔ اس جوش بے ہوش پر تنقید کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ "اس قسم کا علم دینا ممکن ہے بعض وجوہ سے اچھا ہو مگر علمی اصولوں کی رو سے بچے کے حافظے پر ایک بیجا اور غیر مفید بوجھ ڈالنے سے زیادہ نہیں(۱۰)"۔ لیکن وہ اپنی اس رائے پر زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکے۔ انگلستان سے واپس آنے کے بعد دسمبر ۱۹۱۰ء میں "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے موضوع پر جو لکچر انہوں نے اسٹریچی ہال علیگڑھ میں دیا اس سے ان کے پچھلے موقف کی تردید ہوتی ہے۔ نفسیات کے اصولوں کے بجائے ملی حمیت سے سرشار ہو کر وہ اس لکچر میں اپنی غلطی کا اعتراف ان الفاظ میں

کرتے ہیں کہ "وہ لوگ جنہوں نے تعلیم کا یہ اصل الاصول قائم کیا تھا کہ ہر مسلمان بچے کی تعلیم کا آغاز قرآن مجید کی تعلیم سے ہونا چاہیئے وہ ہمارے مقابلے میں ہماری قوم کی ماہیت و نوعیت سے زیادہ باخبر تھے"[۱۱]۔ یہی وہ جذبہ تھا جس کے تحت انھوں نے یورپ سے واپسی پر ملحدانہ انسان پرستی کو خیرباد کہا اور احترام آدمیت کے خدا پرستانہ جذبے کی نشوونما کو قومی تعلیم کا اصل مقصود قرار دیا۔

ادراک، حافظے، تخیّل اور فکر و تمیز کی صلاحیتوں کا تعلق تحصیل علم سے ہے جس سے عقل نظری اپنے کمال کو پہنچتی ہے۔ عقل عملی یا اخلاقی کمال کا انحصار احساس اور قوت ارادی کی صحیح نشوونما پر ہے اعلیٰ سیرت کی تعمیر اور بلند کردار کی تشکیل اس کے بغیر ممکن نہیں۔ کردار کی تشکیل میں اقبال ہمدردی کے وصف کو کلیدی حیثیت دیتے ہیں جس کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کرنا ان کے نزدیک تعلیم کی اصل غایت ہے۔ ہمدردی اخلاقی کمال کی معراج ہے۔ اس کی نشوونما نفسیاتی اصولوں پر مبنی ہے۔ حیاء کی طرح بچوں میں ہمدردی کی صلاحیت بھی ہوتی ہے جو ان کے کردار کی تشکیل کے لئے اساس کا کام دیتی ہے۔ بچہ کسی کو ہنستا دیکھے تو خود بھی ہنستا ہے۔ ماں باپ غمگین نظر آئیں تو خود بھی ویسی ہی صورت بنا لیتا ہے۔ تجربہ اور مشق سے یہ جبلّی قوت بڑھتی جاتی ہے۔ استاد کو چاہیئے کہ وہ اس قوت کو بطریق احسن پختہ اور مستحکم کرے اور بتدریج اس کے دائرے کو وسیع کرے۔ وہ بچے کو ہمدردی کے متعلق عمدہ عمدہ کہانیاں سنائے اور یاد کرائے۔ جس کے متعلق اُسے سبق دینا ہو اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے تاکہ بچے کے لئے ایک مثال تقلید کرنے کے لئے قائم ہو جائے[۱۲]...... نیز اس امر کی طرف پوری توجہ دیتے رہیں کہ بچہ اپنے سبق کے متعلق ضروری ترتیب کا لحاظ رکھے کیونکہ امن اور صلح کاری کی عادت انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں سے پیدا ہوتی ہے۔"[۱۳]

یہ ہے عقل نظری اور عقل عملی کی تربیت کا وہ خاکہ جو اقبال نے اپنے مضمون "بچوں کی تعلیم و تربیت" میں پیش کیا ہے۔ تعلیم کا اصل مقصود، جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، یہ ہے کہ انسان کی "ہمدردی کا دائرہ دن بدن وسیع" ہو (بعد میں اس کی جگہ اخوت، حریّت اور مساوات کی اسلامی تعلیم نے لے لی)

احساس اور قوت ارادی کی صحیح نشوونما سے یہ مقصد بطریق احسن حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن اقبال نے صرف انہی دو قوتوں کی نشوونما پر اکتفا نہیں کیا کیونکہ ان کے نزدیک "نفس ناطقہ قویٰ کا ایک مجموعہ نہیں ہے بلکہ یہ اپنی ذات میں ایک واحد غیر منقسم شے ہے اور اس کی ہر ایک قوت کی نشوونما ہر دوسری قوت کی نشوونما پر منحصر ہے۔ جس طرح جسمانی اعضاء تناسب کے اصولوں کے مطابق بڑھتے ہیں، اسی طرح نفس ناطقہ کے قویٰ کی نشوونما بھی انہی اصولوں کے ماتحت ہوتی ہے۔ لہٰذا طریق تعلیم کامل وہی ہوگا جو نفس ناطقہ کے تمام قویٰ کے لئے یکساں ورزش کا سامان مہیا کرے۔ ادراک، فکر، تخیل تاثر (احساس) مشیت (ارادہ) غرضیکہ نفس ناطقہ کی ہر قوت کو تحریک ہونی چاہیئے"[14]۔

ہمدردی کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کرنا معاشرتی اعتبار سے تعلیم کی اصل غایت سہی لیکن یہ غایت متوازن ذہن کی تشکیل کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ معاشرتی غایت کو انفرادی نشوونما کی نفسیاتی غایت سے الگ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ دونوں ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں

دوسرا دور

۱۹۰۵ء میں انگلستان پہنچنے پر اقبال کے ذہنی ارتقا کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں انہوں نے "فلسفہ عجم" پر ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ لنکنز ان سے بار ایٹ لا کا امتحان پاس کیا۔ لندن اسکول آف اکونومکس اینڈ پولیٹیکل سائنس میں عمرانیات اور سیاسیات پڑھی[15]۔ سید امیر علی اور طامس آرنلڈ کی مخالفت کے باوجود ان کی پرجوش حمایت پر لندن میں قائم "انجمن اسلام" کا نام بدل کر پین اسلامک سوسائٹی رکھا گیا جس میں انہوں نے "اسلامی تصوف" "مسلمانوں کا تہذیب یورپ پر اثر"، "اسلامی جمہوریت" "اسلام اور عقل انسانی" وغیرہ موضوعات پر چھ لکچر دیئے۔ "علی گڑھ کالج کے طلباء کے نام" نظم لکھی اور براہ راست علی گڑھ بھیجی۔

۱۹۰۸ء میں وطن واپس آئے اور چیف کورٹ لاہور سے بیرسٹری کا آغاز کیا۔ جنگ بلقان اور ترپولی نے ان کی اسلامی حمیت پر تازیانہ لگایا۔ اس پس منظر میں انہوں نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں (اپریل ۱۹۱۱ء) اپنی مشہور نظم "شکوہ" سنائی۔ چند ماہ بعد موچی دروازے کے باہر ایک بڑے جلسے میں "جواب شکوہ" تحت اللفظ پڑھا۔ اکتوبر ۱۹۱۱ء میں

شاہی مسجد لاہور میں اپنی تاریخی نظم "خون شہیداں کی نذر" پڑھ کر سنائی اور سامعین کو اشکبار کیا۔

"یورپ کی آب و ہوا" نے اقبال کو "مسلمان کر دیا"۔ ملحدانہ انسان پرستی کے مہلک نتائج نے ان کی آنکھیں کھول دیں اور وہ جغرافیائی وطن پرستی اور جارحانہ قوم پرستی کو انسانیت کا بدترین دشمن سمجھنے لگے۔ "احترام آدمیت" کے اسلامی جذبے میں انہیں امید کی واحد کرن نظر آئی چنانچہ انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو جغرافیائی وطن پرستی کی تلقین کرنا چھوڑ دی اور وطن کی بجائے مذہب کی بنیاد پر انہیں اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرنے کی تلقین کرنے لگے۔ "ترانۂ ہندی" "ہمارا دیس"، "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت"، "ہمالہ" اور "نیا شوالہ" جیسی وطنی قومیت کی نظموں کا دور ختم ہوا اور "علیگڑھ کالج کے طلبا ء کے نام"، "عبدالقادر کے نام" اور "صقلیہ" جیسی اسلامی حمیت سے بھرپور نظموں کا دور شروع ہوا جن کے سوز و گداز سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ وہ اپنی قوم کو اس کی عظیم الشان تاریخ کی یاد دلا کر اس میں حرکت کی روح پھونکنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی "ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر" پر وہ لکچر ہے جو انہوں نے ۱۹۱۰ء میں اسٹریچی ہال علیگڑھ میں دیا اس لکچر میں انہوں نے تعلیم کو "قومی ہستی کے سلسلے کو بلا انقطاع قائم رکھنے کا واحد ذریعہ قرار دیا۔ متوازن ذہن کی تشکیل کے ذریعے ہمدردی کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کرنے کے بجائے تعلیم کا مقصد اب یہ متعین ہوا کہ وہ ثقافتی ورثے کو ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل کرے، فرد کا ملت سے رابطہ استوار کرے، "قومی ہستی" کے تسلسل کو قائم و دائم رکھے اور قومی تشخص کے شعور کو پروان چڑھائے۔

"جب نفس ناطقہ کے سلسلۂ ہوشیاری میں خلل واقع ہو جاتا ہے تو نفس بیمار پڑ جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوائے حیوانی رفتہ رفتہ تحلیل ہو جاتے ہیں۔ یہی حالت اقوام کے نفس ناطقہ کی ہے جس کا تسلسل اس اجتماعی تجربے کے باقاعدہ انتقال پر ہے جو نسلاً بعد نسلٍ قوم کو اپنے اسلاف سے میراث میں پہنچتا رہتا ہے۔ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اس توارث متوالیہ کی موید ہو کر نفس ناطقہ قومی کو استبصار کامل بنائے تاکہ وہ اپنی ذات کے ادراک پر قادر ہو سکے۔ فرد کا

رابطۂ اتحاد اس قوم کے ساتھ جس کا وہ جزو ہے اگر جڑ سکتا ہے تو اس دانستہ کوشش سے۔ تعلیم کے ذریعے سے روایات مجتمع کے جو مختلف اجزا اس طور پر منتقل کئے جاتے ہیں وہ نفس ناطقۂ قومی میں جذب اور پیوستہ ہو کر ان چند افراد قوم کے لئے میل و فرسنگ کا کام دیتے ہیں جن کی پوری زندگی اور کل قابلیت غور و فکر قوم کے مختلف غایات اور مقاصد کی منزلیں طے کرنے میں گذر جاتی ہے۔[۱۶]" اس مفہوم میں تعلیم معاشرے کی محافظ ہے۔ اس کا مقصد فرد کو معاشرے کی ثقافتی زندگی میں بھرپور حصہ لینے کے لئے تیار کرتا ہے، کیونکہ:

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں　　موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

فرد کا ملت سے رشتہ قائم رکھنے کی ایک شرط ہے اور وہ ہے قومی تاریخ کا مطالعہ۔ اس کے بغیر اس میں ملی شعور نہیں پیدا ہو سکتا اور نہ وہ قومی انا کو اپنے اندر جذب کر کے اپنا قومی تشخص قائم رکھ سکتا ہے۔ "افراد کی صورت میں احساس نفس کا تسلسل قوت حافظہ سے ہے۔ اقوام کی صورت میں اس کا تسلسل اور استحکام قومی تاریخ کی حفاظت سے ہے۔ گویا قومی تاریخ حیات ملیہ کے لئے بمنزلۂ قوت حافظہ ہے جو اس کے مختلف مراحل کے حسیات اور اعمال کو مربوط کر کے قومی انا کا زمانی تسلسل محفوظ رکھتی ہے۔[۱۷]"

یہ ہے عمرانی اعتبار سے اقبال کے نزدیک تعلیم کا بنیادی مقصد جسے سامنے رکھ کر انہوں نے مروجہ نظام تعلیم کا جائزہ لیا تو بڑے دکھ کے ساتھ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ ہمارے مخصوص عمرانی تقاضوں اور معاشرتی ضرورتوں کو پورا نہیں کر رہا ہے۔ اس کے برعکس وہ نئی نسل کو اس کے ثقافتی ورثے سے بیگانہ کر رہا ہے، اس کے قومی تشخص کو ختم کر رہا ہے اور حیات ملیہ سے اس کا رشتہ توڑ رہا ہے۔ چنانچہ انہیں واشگاف الفاظ میں کہنا پڑا کہ "موجودہ نسل کا نوجوان مسلمان قومی سیرت کے اسالیب کے لحاظ سے ایک بالکل نئے اسلوب کا حامل ہے جس کی عقلی زندگی کی تصویر کا پردہ اسلامی تہذیب کا پردہ نہیں ہے، حالانکہ اسلامی تہذیب کے بغیر میری رائے میں وہ صرف نیم مسلمان بلکہ اس سے بھی کچھ کم ہے اور وہ اس صورت میں کہ اس کی خالص دنیوی تعلیم نے اس کے مذہبی عقائد کو متزلزل نہ کیا ہو۔ اس کا دماغ مغربی خیالات

کی جولانگاہ بنا ہوا ہے .... اس نے اپنی قومی زندگی کے ستون کو اسلامی مرکز ثقل سے بہت پرے ہٹا دیا ہے۔"[18]

اس المیے کا انہیں صرف ایک ہی حل نظر آیا کہ جہاں تک ہو سکے جلد از جلد ایک "نیا مثالی دارالعلوم قائم کیا جائے جس کی مسند نشین اسلامی تہذیب ہو اور جس میں قدیم اور جدید کی آمیزش عجب دلکش انداز میں ہوئی ہو۔ اس قسم کی تصویر خیالی کھینچنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے اعلیٰ تخیل، زمانے کے رجحانات کا لطیف احساس اور مسلمانوں کی تاریخ اور مذہب کے مفہوم کی صحیح تعبیر ضروری ہے"[19]۔ اسلامی حمیت کے جوش میں انہوں نے ہمیں مغربی علوم پڑھنے سے منع نہیں کیا۔ اس کے برعکس انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ "مسلمانوں کو بیشک علوم جدیدہ کی تیز رفتار کے قدم بہ قدم چلنا چاہئیے، لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی تہذیب کا رنگ خالص اسلامی ہو اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ایک ایسی یونیورسٹی موجود نہ ہو جسے ہم اپنی قومی تعلیم کا مرکز قرار دے سکیں"[20]۔

نئے "مثالی دارالعلوم" کے قیام سے بھی زیادہ اہم اقبال کے نزدیک عورتوں کی صحیح مذہبی تعلیم ہے۔ اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں رسمی تعلیم کے ادارے ہیں۔ پانچ سال سے کم عمر کا بچہ اسکول میں داخل نہیں ہو سکتا۔ قبل اسکول عمر کے حصے میں بچے کی تعلیمی ضروریات کو خاندان پورا کرتا ہے جو نومولود کو معاشرے کی ثقافت میں ڈھالنے کا بنیادی ادارہ ہے۔ تعاشر کا عمل بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے اور ماں کی گود اس کا گہوارہ بنتی ہے۔ بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے ماں باپ اس کے مذہبی کردار کی صورت گری کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے معاشرے میں مذہب کی سب سے بڑی امین اور محافظ "عورت ہے وہی قوم کی حقیقی معمار ہے۔ تعلیم ہمیشہ "قومی ضروریات کے تابع ہوتی ہے"۔ اس لئے عورتوں کو صحیح مذہبی تعلیم دینا حیات ملیہ کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے ازبس ضروری ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اقبال نے تعلیم نسواں کا جو نصاب تجویز کیا وہ درج ذیل ہے۔

"چونکہ عورت کے دل و دماغ کو مذہبی تخیل کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہے لہذا قومی ہستی کی مسلسل بقا کے لئے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنی عورتوں کو ابتدا میں ٹھیٹھ مذہبی تعلیم دیں۔ جب وہ مذہبی تعلیم سے فارغ ہو چکیں تو ان کو اسلامی تاریخ، علم تدبیر، خانہ داری اور علم اصول صحت پڑھایا جائے۔ اس سے ان کی دماغی قابلیتیں اس حد تک نشوونما پا جائیں گی کہ وہ اپنے شوہروں سے تبادلۂ خیالات کر سکیں گی اور امومت کے وہ فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں گی جو میری رائے میں عورت کے فرائض اولین ہیں[۲۱]" ایک مرد کو تعلیم دو تو اس سے صرف ایک فرد فیض یاب ہوتا ہے۔ ایک عورت کو تعلیم دو تو اس سے سارا خاندان مستفید ہوتا ہے۔ اس لئے اقبال عورتوں کی صحیح مذہبی تعلیم کو اپنے مجوزہ "شالی دارالعلومؒ" کے قیام سے بھی زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔

تیسرا دور

یہ اقبال کی فلسفیانہ فکر کا تخلیقی دور ہے۔ اسرار خودی اور رموز بیخودی اسی دور کے شاہکار ہیں۔ ان میں سے پہلی مثنوی ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی اور دوسری ۱۹۱۸ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ دونوں مثنویاں فارسی میں ہیں۔ اقبال طہران کو عالم اسلام کا مرکز بنانا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنے پیغام کو بالخصوص ایرانیوں تک پہنچانے کے لئے فارسی میں شعر کہنا شروع کیا

طہران ہو گر عالم مشرق کا جنیوا　　شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے　(ضرب کلیم)

اسرار خودی میں اقبال نے اس بات پر زور دیا کہ زندگی کا اصل محرک اس کی اپنی ذات کے اثبات کا جذبہ ہے۔ یہ جذبہ نت نئے مقاصد کی تخلیق کر کے اسے ہمیشہ آگے بڑھنے کی ترغیب دیتا ہے اور اس طرح اس کی ذات کے اثبات، توسیع، تسلسل اور بقا کا سامان مہیا کرتا ہے۔ زندگی کے اس نمو پذیر اور محیط بالذات مرکز کو اقبال خودی کہتے ہیں۔ خودی کا اپنے آپ سے رشتہ علم و ادراک کا رشتہ ہے جس سے اس پر یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ وہ ایک بامقصد ہستی ہے اور یہ کہ آرزو و عمل اس کی روح رواں ہیں۔ فطرت، خواہ

وہ اس کی اپنی طبیعت ہو یا دنیائے آب و گل، اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے لیکن اسے مسخر کرنے ہی سے اس کی پنہاں قوتیں ظاہر ہوتی ہیں اور وہ استحکام اور ترقی کی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ جس طرح فطرت کی تسخیر سے اس کی ذات کا اثبات ہوتا ہے اسی طرح خدا کے قرب سے وہ انفرادیت سے مالامال ہوتی ہے۔ انسان "ہنوز مکمل انفرادیت نہیں اس کا خدا سے جتنا بعد ہوتا ہے اتنی ہی اس کی انفرادیت ضعیف ہوتی ہے۔ جو شخص خدا سے سب سے زیادہ قریب ہے وہی سب سے زیادہ کامل ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ خدا میں جذب ہو جاتا ہے، اس کے برخلاف وہ خدا کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے[۲۲]"۔ جذب کی یہ قوت اسے عشق سے حاصل ہوتی ہے جس سے خودی منفرد اور مستحکم ہوتی ہے۔ اسی طرح سوال سے اس کے اجزار منتشر، اس کی قوت زائل اور اس کا مرتبہ کم ہوتا ہے، خواہ یہ سوال (گدائی) مال و دولت کا ہو یا افکار و تخیل کا۔

رموز بیخودی اسرار خودی کا تکملہ ہے۔ انفرادیت کی نشو و نما مقصود بالذات نہیں بلکہ "ایک مربوط اور متناسب عمرانی نظام" قائم کرنے کے لئے بہترین تیاری ہے۔ اس کا انتہائی کمال جمعیت سے دوری نہیں بلکہ اجتماعی شعور پیدا کر کے ملی انا کو اپنے اندر جذب کرنا ہے۔ ملت سے وابستگی اس کی پنہاں اخلاقی قوتوں کو بروئے کار لاتی ہے جس طرح فطرت سے تصادم اس کی تسخیر کی قوتوں کو نمایاں کرتا ہے۔ اس قسم کی وابستگی اور جمعیت مذہب اور صرف مذہب کی بنا پر ممکن ہے۔ اگر اس کی بنیادیں ملک، وطن یا نسل پر استوار ہوں گی تو یہ جمعیت ناپائیدار ہوگی۔ پس خودی خدا، فطرت اور ملت سب کو اپنے اندر جذب کر کے آگے بڑھتی ہے اور اس طرح زندگی کا نہ صرف تحفظ بلکہ اس کے تسلسل اور تمول کا سامان بھی مہیا کرتی ہے۔

فکری ارتقا کے پہلے دور میں اقبال کی دلچسپیوں کا مرکز بچوں کی نفسیات تھی۔ چنانچہ کامیاب اور مؤثر تعلیم کے لئے انہوں نے یہ ضروری قرار دیا کہ نصاب کی تدوین میں بچوں کے

"قوائے عقلیہ و واہمہ کے مدارج نمو کو ملحوظ رکھا جائے اور متوازن ذہن کی تشکیل کے ذریعے ان کی ہمدردی کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کیا جائے۔ دوسرے دور میں جب یورپ کی آب و ہوا" نے انہیں "مسلمان کر دیا" تو ان کی دلچسپی عمرانیات میں بڑھ گئی اور انہوں نے ملی روایات کے تحفظ اور قومی ہستی کے تسلسل کو تعلیم کا بنیادی مقصد قرار دیا۔ تیسرے دور میں انہوں نے زندگی کے متعلق خود اپنا ایک فلسفہ پیش کیا جس پر دینی عینیت کی چھاپ ہے۔ تعلیم ہمیشہ فلسفۂ حیات کے تابع ہوتی ہے۔ اس لئے اس دور میں خودی کی نشو و نما اور اس کا تحفظ تعلیم کی غایت الغایات بن گیا۔ خودی چونکہ زندگی کی نمو پذیر تخلیقی قوت کا نام ہے جو مقصد، آرزو اور عمل کے ذریعے ارتقائی مراحل طے کرتی ہے، اس لئے اس کی نشو و نما دراصل زندگی کے تسلسل کو جاری رکھنے اور اس کے تمول میں اضافہ کرنے کا دوسرا نام ہے۔

ذہن کی نشو و نما، جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، نفسیات کے اصولوں کی تابع ہے۔ لیکن ذہن محض ایک آلہ ہے جو ارتقا پذیر زندگی نے اپنے تسلسل کو جاری رکھنے کے لئے اپنے اندر سے پیدا کیا ہے[۲۲]۔ اس لئے اس کی نشو و نما مقصود بالذات نہیں جب کہ خودی کی نشو و نما مقصود بالذات ہے۔ ذہن خودی کے مقاصد کو پورا کرنے کا ایک آلہ ہے اور آلہ استعمال کرنے والے کی نشو و نما کی اساس ان اصولوں پر نہیں رکھی جا سکتی جو خود آلے کی نشو و نما کی اساس ہیں۔ خودی کی نشو و نما کی اساس خود اس کا خالق ہے جس کے قریب سے قریب تر آنے میں اس کی انفرادیت کی تکمیل کا انحصار ہے اور اجتماعی شعور کے ارتقا کا بھی۔ اسی موقف کے تحت اقبال نے انفرادی اور اجتماعی خودی کی نشو و نما کے لئے دو الگ الگ سہ نکاتی پروگرام پیش کئے جن کی طرف اب ہم رجوع کریں گے۔

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت انفرادی خودی کی تربیت کا پہلا مرحلہ ہے خدا نے نفس کی مختلف قوتوں کی تگ و دو کے لئے کچھ حدود مقرر کی ہیں۔ ان حدود کو شریعت یا قانون الٰہی کہتے ہیں۔ شریعت کی پابندی خدا کا تقرب حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ اس سے خودی کو

اپنی آزادی کی حد کا پتہ چلتا ہے اور وہ افراط و تفریط سے بچ کر صراط مستقیم پر چلتی ہے جو اس کی انفرادیت کے ارتقا کی لازمی شرط ہے۔ ضبط نفس خودی کی تربیت کا دوسرا مرحلہ ہے جو توحید، صوم، صلوٰۃ، زکوٰۃ اور حج کے ارکان خمسہ پر مشتمل ہے۔ آخری چار ارکان توحید کے تصور کو زندگی میں ایک رواں دواں قوت بنانے کا ذریعہ ہیں۔ اس سے خودی بتدریج خدا کا تقرب حاصل کر کے نیابت الٰہی کے منصب پر فائز ہوتی ہے جو اس کی تربیت کا تیسرا اور آخری مرحلہ ہے۔ اس مرحلے میں اعلیٰ ترین طاقت اعلیٰ ترین علم سے متحد ہو جاتی ہے جو انفرادیت کے ارتقا کی آخری منزل ہے۔

انفرادیت کی نشوو نما مقصود بالذات نہیں بلکہ جمعیت کے استحکام کا ایک ذریعہ ہے۔ نیابت الٰہی کے منصب پر فائز خودی اجتماعی شعور پیدا کئے بغیر اپنی ذات میں پنہاں اخلاقی قوتوں کو بروئے کار نہیں لاسکتی اور نہ ملی انا کو اپنے اندر جذب کر کے قومی ہستی کے تسلسل کو قائم رکھ سکتی ہے۔ نبوت کا مقصود گوشہ نشین "کامل انسان" پیدا کرنا نہیں بلکہ ایک ایسا "مثالی معاشرہ" قائم کرنا ہے جس کی بنیاد "آدمیت کے احترام" پر استوار ہو اور یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے جب کہ حریت، مساوات اور اخوت کے اصولوں پر متواتر عمل کے ذریعے فرد میں ایک اجتماعی شعور پیدا ہو۔ خودی اخلاق کی خالق ہے اور حریت (آزادی فکر و عمل) وہ قدر ہے جو اس کی تخلیقی قوتوں کو مہمیز کرتی ہے۔ اس کے بغیر اخلاقی جدوجہد کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مساوات آزادی سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی لازمی شرط ہے اور جمعیت کے استحکام کی واحد ممکن صورت۔ جب تک ہر فرد کو رنگ، خون اور نسل کے امتیازات سے ماوراء مادی اور روحانی ترقی کے یکساں مواقع حاصل نہ ہوں اس وقت تک اجتماعیت کا انفرادیت سے اتحاد نہیں ہو سکتا۔ مساوات معاشرے کی تنظیم کا ایک صوری اصول ہے۔ اسے ایک عملی اور ٹھوس شکل دینے کا انحصار اخوت کے جذبے پر ہے۔ اس کے بغیر نہ مساوات کا حق ادا ہوتا ہے اور نہ معاشرتی زندگی میں

کبھا کبھی پیدا ہوتی ہے۔ اسلام کا "مثالی معاشرہ" ایک روحانی برادری ہے جس میں ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ ان میں آپس میں رشتہ محبت و الفت کا رشتہ ہے جو مساوات کو ملحوظ رکھنے اور عدل سے پہلو تہی نہ کرنے کے لئے داخلی طور پر راہ ہموار کرتا ہے۔

یہ ہے انفرادی اور اجتماعی خودی کی تربیت کا وہ پروگرام جو اقبال نے اسرار خودی اور رموز بیخودی میں علی الترتیب پیش کیا۔ یہاں پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ ان مثنویوں میں اقبال نے تربیت پر اتنا زور دیا ہے کہ تعلیم کے تقاضے ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ لیکن یہ کوئی اتفاقی امر نہیں ہے۔ فکری ارتقاء کے اس تیسرے دور میں انہیں شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ مسلمانوں کو اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے تعلیم سے زیادہ تربیت کی ضرورت ہے۔ اس خیال کا اظہار انہوں نے نہایت ہی پر زور الفاظ میں ایک "محفل میلاد النبی" میں کیا۔ "پچاس سال سے شور برپا ہے کہ مسلمانوں کو تعلیم حاصل کرنی چاہیئے لیکن جہاں تک میں نے غور کیا ہے تعلیم سے زیادہ اس قوم کی تربیت ضروری ہے اور ملی اعتبار سے یہ تربیت علماء کے ہاتھ میں ہے"۔[۲۴]

چوتھا دور۔

یہ اقبال کے ذہنی ارتقاء کا آخری دور ہے۔ جس طرح تیسرا دور ان کی فلسفیانہ فکر کا تخلیقی دور تھا، اسی طرح چوتھا دور ان کی دینی فکر کا تخلیقی دور ہے جس میں یہ سوال ان کی توجہ کا مرکز بنا کہ اسلام کے ابدی قانون میں حرکت کی روح کس طرح پھونکی جائے؟ زندگی کی اساس بلاشبہ روحانی اور ابدی ہے لیکن ابدی اصول ان کے نزدیک "تغیر و تبدل کے امکانات کو بالکل ختم نہیں کر دیتے، کیونکہ تغیر قرآن کی رو سے اللہ تعالےٰ کی ایک بڑی نشانی ہے جسے نظر انداز کر کے ہم اس شے کو جس کی فطرت ہی حرکت ہے حرکت سے عاری کر دیں گے"۔[۲۵] فقہی اصطلاح میں حرکت کے اس اصول کا نام اجتہاد ہے۔ چنانچہ فقہ اسلامی میں اجتہاد کے تصور پر انہوں نے ۱۹۲۲ء میں انگریزی میں ایک مقالہ لکھا

اور حبیبیہ ہال میں پڑھا[۲۶] لیکن بعض حلقوں کی طرف سے اس پر سخت نکتہ چینی کی گئی، اس لئے انہوں نے "اس وقت اسے شائع نہیں کیا۔ بہرحال ان کے موقف میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور وہ برابر اس مسئلے کی تحقیق کرتے رہے۔ مارچ ۱۹۲۶ء میں سید سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے۔ اس بحث پر مصر میں ایک چھوٹی سی کتاب شائع ہوئی تھی جو میری نظر سے گذری ہے مگر افسوس ہے کہ بہت مختصر ہے اور جن مسائل پر بحث کی ضرورت ہے مصنف نے انہیں نظر انداز کر دیا ہے۔ اگر مولانا شبلی زندہ ہوتے تو میں ان سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا۔ موجودہ صورت میں سوائے آپ کے اس کام کو کون کرے گا۔ میں نے ایک رسالہ اجتہاد پر لکھا تھا مگر چونکہ میرا دل بعض امور کے متعلق مطمئن نہ تھا اس واسطے اس کو اب تک شائع نہیں کیا۔[۲۷]"

بہرحال ۱۹۳۰ء میں ان کے خطبات کا جو مجموعہ "تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" کے نام سے شائع ہوا اس میں چھٹا خطبہ "اجتہاد فی الاسلام" پر ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ بعد میں وہ اپنی تحقیق کے نتائج سے مطمئن ہو گئے تھے۔ یہاں پر یہ بات قابل غور ہے کہ اجتہاد کے ذریعے "فکر دینی کی تعمیر نو" کو وقت کی سب سے بڑی ضرورت قرار دینے کے لئے انہوں نے ان خطبات کا نام ہی "تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" رکھا۔

اجتہاد کے مسئلے پر اقبال کافی عرصے تک بڑی سنجیدگی سے غور کرتے رہے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس حق کو استعمال کر کے فقہ اسلامی کی تعمیر نو وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام ایک خط (۲ ستمبر ۱۹۲۵ء) میں لکھتے ہیں "میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ حال کے جورس پروڈنس پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا، وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔[۲۸]"

اپریل ۱۹۲۶ء میں سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں انہوں نے دوبارہ اس بات پر زور دیا۔ "میرا مقصود یہ ہے کہ زمانۂ حال کے جورس پروڈنس کی روشنی میں اسلامی معاملات کا مطالعہ کیا جائے، مگر غلامانہ انداز میں نہیں بلکہ ناقدانہ انداز میں۔ اس سے پہلے مسلمانوں نے عقائد کے متعلق ایسا ہی کیا ہے۔"(۲۹)

۱۹۲۶ء میں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں علوم اسلامیہ کا ایک الگ شعبہ قائم کیا گیا۔اقبال کے استاد طامس آرنلڈ نے بی اے، بی اے (آنرز) اور ایم اے کی جماعتوں کے لئے اسلامیات کا نصاب مرتب کیا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خان نے شعبے کے مقاصد اور مجوزہ نصاب کی ایک نقل اقبال کی رائے معلوم کرنے کے لئے انہیں بھیجی۔ اقبال کے ذہن پر اس زمانے میں اجتہاد کی ضرورت شدت سے حاوی تھی۔ چنانچہ مجوزہ نصاب پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے ۴ رجون ۱۹۲۵ء کو صاحبزادہ آفتاب احمد خان کو جو طویل جواب بھیجا اس میں بالالتزام اس بات پر زور دیا کہ تعلیم کا مقصد دینی سرمائے کا صرف تحفظ ہی نہیں بلکہ بدلی ہوئی روحانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اس کی تعمیر نو بھی ہے۔ اس نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے جو موقف انہوں نے اختیار کیا۔ وہ درج ذیل ہے۔

"ہمارا پہلا مقصد جس کی بابت ہم دونوں متفق ہیں موزوں صفات کے علماء پیدا کرنا ہے جو ملت کی روحانی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔ مگر زندگی کے متعلق ملت کے زاویۂ نگاہ کے دوش بدوش ملت کی روحانی ضرورتیں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ فرد کی حیثیت سے اس کی دماغی نجات و آزادی اور طبعی علوم کی غیر متناہی ترقی۔ان چیزوں میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے اس نے جدید زندگی کی اساس کو یکسر متغیر کر دیا ہے۔ چنانچہ جس قسم کا علم کلام اور علم دین ازمنۂ وسطیٰ کے مسلمانوں کی تسکین قلب کے لئے کافی ہوتا تھا وہ آج تسکین بخش نہیں ہے۔اس سے مذہب کی روح کو صدمہ پہنچانا مقصود نہیں ہے اجتہادی گہرائیوں کو دوبارہ حاصل کرنا مقصود ہے تو فکر دینی کو از سر نو تعمیر کرنا قطعاً ضروری ہے۔

مجھے اندیشہ ہے کہ میں آپ کے مسلم دینیات کے مجوزہ نصاب سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ میرے نزدیک قدیم طرز پر مسلم دینیات کا شعبہ قائم کرنا بالکل بے سود ہے۔ جہاں تک روحانیات کا تعلق ہے، کہا جا سکتا ہے کہ قدیم تر دینیات فرسودہ خیالات کی حامل ہے اور جہاں تک تعلیمی حیثیت کا تعلق ہے جدید مسائل کے طلوع اور قدیم مسائل کی طرح نو کے مقابلے میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ آج ضرورت ہے کہ دماغی اور ذہنی کاوش کو ایک نئی وادی کی طرف مہمیز کیا جائے اور ایک نئی دینیات اور کلام کی تعمیر و تشکیل میں اسے بروئے کار لایا جائے۔"[۳۰]

تعلیم کا مقصد ثقافتی سرمائے کا صرف تحفظ ہی نہیں بلکہ عمرانی، طبیعی اور حیاتیاتی علوم میں جدید ترین تحقیق کی روشنی میں اس کی تعمیر نو بھی ہے تاکہ ملت کی بدلی ہوئی روحانی ضروریات کو پورا کرکے وہ "قومی ہستی کے سلسلے کو بلا انقطاع قائم" رکھنے کا فرض انجام دے سکے۔ پس "الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل نو" اقبال کے نزدیک آج تعلیم کا اولیں مقصد ہے جس سے ان کی مراد "ایک نئی دینیات اور کلام کی تعمیر" اور فقہ اسلامی کی تشکیل نو ہے تاریخی اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مقصد ۱۹۲۵ء میں واضح ہو کر اقبال کے سامنے آیا اور پھر مسلسل ان کی فکر پر حاوی رہا۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے اپنے خطبۂ الٰہ آباد میں برصغیر کے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ ریاست کا مطالبہ ان الفاظ میں کیا۔ "اس سے اسلام کو ان اثرات سے جو عربی شہنشاہیت اس پر ڈالنے پر مجبور تھی، آزاد ہونے اور اس طرح اپنے قانون، اپنی تعلیم اور اپنی ثقافت کو حرکت میں لانے اور انہیں ان کی اصل روح اور زمانۂ حال کی روح کے قریب لانے کا موقع ملے گا۔"[۳۱]

یہ ہے اقبال کی تعلیمی فکر کا چوتھا اور آخری دور۔ ان چار ادوار میں یکے بعد دیگرے تعلیم کے چار مقاصد ان کے سامنے آئے۔ پہلے دور میں شاگرد ان کے نزدیک جسم کے قالب میں ایک ذہن تھا۔ اس لئے انہوں نے متوازن ذہن کی تشکیل کے ذریعے ہمدردی کے دائرے

کو وسیع تر کرنے پر زور دیا۔ دوسرے دور میں نفسیات کی جگہ عمرانی تقاضوں نے لے لی اور انہوں نے "قومی ہستی کے سلسلے کو بلا انقطاع قائم" رکھنے کے لئے ثقافتی ورثے کو نئی نسل میں منتقل کرنے کو تعلیم کا بنیادی مقصد قرار دیا۔ تیسرے دور میں عمرانیات کی جگہ فلسفے نے لے لی۔ جسم اور روح کی وحدت نے ایک مقصود بالذات خودی کی شکل اختیار کر لی جس کی نشوونما زندگی کے تسلسل کو جاری رکھنے اور اس کے تمول میں اضافہ کرنے کے لئے تعلیم کا مقصود بن گئی۔ چوتھے دور میں سائنس کی ایجادات سے پیدا ہونیوالے معاشرتی تغیرات اور اس ضمن میں اجتہاد کی ضرورت ان کی توجہ کا مرکز بنی اور انہوں نے حیات ملیہ کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے "فکر دینی کی تعمیر نو" کو تعلیم کا اولیں مقصد قرار دیا۔

حوالہ جات

۱۔ قرآن، ۲ : ۲۶۹

۲۔ سید عبدالواحد معینی (مرتب)، مقالات اقبال، شیخ محمد اشرف، لاہور ۱۹۶۳ء، ص ۱۲۴۔

۳۔ ایضاً، ص ۱۱۹۔

۴۔ محمد حسین خاں زبیری (مرتب) مشاہیر کے تعلیمی نظریئے، جاوید پریس کراچی س۔ن ص ۲۶۸۔

۵۔ مقالات اقبال، ص ۲۱۰۔

۶۔ لطیف احمد شروانی، مؤلف، حرف اقبال، لاہور، المنار اکیڈمی، ۱۹۴۷ء ص ۲۴۶ - ۲۴۷۔

۷۔ ایضاً، ص ۳۔

۸۔ ایضاً ، ص ۴ ۔
۹۔ ایضاً ، ص ۷ ۔
۱۰۔ ایضاً ، ص ۸ ۔
۱۱۔ ایضاً ، ص ۱۳۲ ۔
۱۲۔ ایضاً ، ص ۶ ۔
۱۳۔ ایضاً ، ص ۸ ۔
۱۴۔ ایضاً ، ص ۹ ۔
۱۵۔ عبداللہ انور بیگ ، دی پوئیٹ آف دی ایسٹ ، قومی کتب خانہ ، لاہور ، ۱۹۳۹ء ، ص ۳۰ ۔
۱۶۔ مقالات اقبال ، ص ۱۳۱ ۔
۱۷۔ ایضاً ، ص ۱۹۱ - ۱۹۲ ۔
۱۸۔ ایضاً ، ص ۱۳۲ ۔
۱۹۔ ایضاً ، ص ۱۳۵ - ۱۳۶ ۔
۲۰۔ ایضاً ، ص ۱۳۴ ۔
۲۱۔ ایضاً ، ص ۱۳۸ ۔
۲۲۔ دیباچہ اسرار خودی ، انگریزی ترجمہ از آر۔ اے۔ نکلسن بعنوان سیکریٹس آف دی سیلف ، شیخ محمد اشرف ، لاہور ، ۱۹۴۴ ، ص ۱۹ ۔
۲۳۔ کلیات اقبال فارسی (اسرار خودی) شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور ، ۱۹۷۵ء ، ص ۱۷ ۔
۲۴۔ مقالات اقبال ، ص ۱۹۷ ۔
۲۵۔ اقبال ، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ ، مترجم نذیر نیازی ، لاہور ، ۱۹۵۸ ، ص ۲۲۷

۲۶ - ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، اقبال کا ذہنی ارتقاء، لاہور، ۱۹۷۸، ص ۱۱۱ - ۱۱۲ -

۲۷ - شیخ عطاء اللہ، مؤلف، اقبال نامہ (مجموعہ مکاتیب اقبال)، لاہور، شیخ محمد اشرف، س۔ن
حصہ اول، ص ۱۴۲ -

۲۸ - ایضاً، ص ۵۱ -

۲۹ - ایضاً، ص ۱۴۷ -

۳۰ - مشاہیر کے تعلیمی نظریے، ص ۲۷۰ - ۲۷۱ -

۳۱ - شاملو (مؤلف) اسپیچز اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال، المنار اکیڈمی، لاہور، ۱۹۴۴،
ص ۱۵ -